انتظار حسین

اپنی آگ کی طرف

میں نے اسے آگ کی روشنی میں پہچانا۔ قریب گیا۔ اسے ہٹوکا۔ اسنے مجھے دیکھا پھر جواب دیئے بغیر ٹکٹکی باندھ کر جلتی ہوئی بلڈنگ کو دیکھنے لگا۔ میں بھی چپ کھڑا دیکھتا رہا۔ مگر شعلوں کی تپش یہاں تک آ رہی تھی۔ میں نے اسے گھسیٹا، کہا کہ چلو۔ اس نے مجھے بے تعلقی سے دیکھا۔ پوچھا" کہاں ؟" میں چپ ہو گیا جیسے اس سوال کا کوئی جواب نہیں ہو سکتا تھا۔

پھر اس نے تیسری منزل والے کونے کے کمرے کی طرف اشارہ کیا جو دھوئیں سے اٹا ہوا تھا اور جس کی دیوار سے پلستر کے جلتے ہوئے پترٹرکے پترٹر گر رہے تھے : "میں اس کمرے میں رہتا تھا۔"

" مجھے معلوم ہے :" میں نے جواب دیا۔

ایک دھوتی پوش سائیکل سوار کیریر پہ دودھ سے بھری بڑی سی گڑوی باندھے پیڈل پہ زور زور سے قدم مارتا قریب آیا۔ سائیکل سے اترا۔ اس حواس باختہ مجمع میں سننے اور جواب دینے کا کسے ہوش تھا۔ ہمیں چپ چاپ کھڑا دیکھ کر ہمارے قریب آیا۔ اس سے مخاطب ہوا" بابو جی کیسے آگ لگ گئی :" اس نے جواب میں سائیکل والے کو غور سے دیکھا اور پھر جلتی ڈھتی عمارت کو دیکھنے لگا۔ سائیکل والے کو اپنے سوال کا جواب مل گیا تھا یا پھر وہ اپنے سوال ہی سے بے نیاز ہو چکا تھا۔ حیرت سے جلتی ہوئی عمارت کو دیکھتا رہا۔ پھر بے کچھ کہے سنے سائیکل پہ سوار ہو، چلا گیا۔

ایک تانگے والے نے تانگہ دوڑاتے دوڑاتے جلدی سے تانگہ روکا۔ تانگہ سڑک کے کنارے کھڑا کیا۔ پھر تانگہ سے کود کر بھاگا ہوا آیا اور بے کچھ بولے بات کئے اندر سے سامان نکالنے والوں کے ساتھ لگ گیا۔

"تم نے اپنا سامان نکالا؟"

"نہیں۔"

"کیوں؟"

"گھر کی چیزیں گھر کے اندر رکھے رکھے جڑ پکڑ لیتی ہیں۔ پھر انہیں ان کی جگہ سے اٹھانا بہت مشکل ہوتا ہے۔ لگتا ہے کہ درخت اکھاڑ رہے ہو۔" چپ ہوا، پھر بولا "تمہیں پتہ ہے، میں یہاں کب سے رہتا تھا۔"

"پتہ ہے۔"

"پھر؟" اس نے مجھے یوں دیکھا جیسے مجھے لاجواب کر دیا ہے۔

یہ اس نے غلط نہیں کہا۔ میں نے تو طالب علمی کے زمانے سے اسے اسی بلڈنگ کے اسی کمرے میں دیکھا تھا۔ وہ ہوسٹل میں کبھی نہیں رہا۔ کمرہ کرائے پہ لے لیا تھا۔ اسی میں رہا۔ اسی میں ہم نے امتحان کے دنوں کی راتیں جاگ جاگ کر کاٹی تھیں۔ میرے لئے وہ اور اس کا کمرہ لازم و ملزوم تھے۔ میٹرک کیا۔ بی اے کیا، ایم اے کیا۔ پھر بے روزگاری۔ پھر چھوٹی موٹی ملازمت۔ بہر حال وہ یہیں رہا۔ یہیں ہم نے اس بلیڈ سے جسے میں اپنے والد کے شیونگ باکس سے چرا کر لایا تھا۔ پہلی مرتبہ شیو کی تھی۔ اور اب اس کی کنپٹی کے سب بال سفید ہو چکے تھے۔ اور میرے بھی۔

اس بلڈنگ میں رہنے والے اور لوگ بھی نئے نہیں تھے۔ منزل بہ منزل فلیٹ ہی فلیٹ تھے جن میں ہر قماش کا آدمی آباد تھا۔ کوئی مقامی کوئی مہاجر۔ کوئی کسی دفتر میں کلرک کوئی کسی کالج میں استاد۔ کوئی صاحب اہل و عیال ہے کہ سال بہ سال بڑھتے ہوئے خاندان کے ساتھ چھوٹی سی چھت کے نیچے سر چھپائے بیٹھا ہے۔ کوئی چھڑا ہے کہ دن بھر مٹر گشت کرتا ہے اور رات گئے تالا کھول کمرے میں پڑ رہتا ہے۔ کسی کا پنشن پہ گذارا ہے، کسی نے کوئی چھوٹا موٹا کاروبار کر رکھا ہے کسی نے یہیں اسی بلڈنگ کی دو کانوں میں سے کوئی دو کان لے رکھی ہے اور چٹی بچھائے بیٹھا ہے ان دوکانوں کا بھی خوب رنگ تھا۔ بعض دوکانیں تو واقعی چمکتی دمکتی تھیں۔ سجے ہوئے مال و اسباب کی اسکیم بدلتی رہتی تھی، سنورتی رہتی تھی۔ لیکن ایسی دوکانیں بھی تھیں جن میں جو کنستر، جو ڈبہ، جو بوری

یا جیسے یہ دوکان کا مال نہیں بلکہ اس عمارت کی پھپھوندی ہے کہ لگ گئی سو لگ گئی، اب اتر نہیں سکتی۔ مال و اسباب پر منحصر نہیں یہاں کے بعض بوڑھے بھی اس عمارت کی پھپھوندی سی لگتے تھے۔ میں اپنے آپ کو اور انہیں دیکھتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ جوانی دنوں میں کیسے چلی جاتی ہے۔ ان بوڑھوں کو دیکھتا ہوں جنہیں ہم نے اپنے لڑکپن میں بوڑھا ہی دیکھا تھا۔ اور سوچتا ہوں کہ بڑھاپے کو کتنا قرار اور ثبات ہے۔ شاید عمر بھی ایک مقام پر آکر ٹھہر جاتی ہے۔ خیر اس وقت تو کسی کو قرار نہیں تھا۔ مکین مکانوں سے اور مال و اسباب دکانوں سے نکلا پڑتا تھا۔ جیسے کسی نے مشعال سے چھتے کو سلگا دیا ہے اور بھڑیں بلبلا کر نکل پڑی ہیں، بھنبھنا رہی ہیں، چیخیں، ایک دوسرے کو آوازیں، غصیلی آوازیں، درد بھری آوازیں، اذیت ناک آوازیں، گرتی پڑتی عورتیں بچے، بوڑھے۔ باہر ڈھلتا ہوا سامان، لپک کر آتے ہوئے لوگ، اس غیر وقت ہیں کہ ابھی صبح نہیں ہو پائی تھی جس جس نے شور سنا آ پہنچا۔ کچھ پانی کی بالٹیاں بھر بھر کے لائے تھے۔ کچھ ڈھاٹے منہ پر باندھ کر اندر گھس پڑے اور اندر کا سامان اندھا دھند باہر پھینکنے لگے۔

"ارے بھائی مختار صاحب کو بھی پتہ ہے یا نہیں؟" کسی نے دیکا یک چلا کر کہا۔

"اسے تو اس وقت پتہ چلے گا جب سب جل جائے گا۔" کسی نے غصے میں کہا۔

"اطلاع دے دینی چاہئے!"

"اطلاع دینے کون جائے جی۔ یاں جاؤں پہ بن ہوئی ہے۔"

پھر کسی طرف سے بھاگے بھاگے دو سقے آئے۔ سڑک پہ لگے ہوئے نل سے مشکیں بھریں اور لپک جھپک جلتی عمارت کے اندر گھس گئے۔

"ارے بھئی کسی نے فائر بریگیڈ والوں کو اطلاع دی ہے؟"

"پتہ نہیں جی۔"

"اطلاع نہیں ہے تو پھر جلدی دے دینی چاہئے۔"

"فائر بریگیڈ والوں کا فون نمبر کیا ہے؟"

"فون نمبر؟ ...... ا‌بے بھئی کسی کو فائر بریگیڈ والوں کا فون نمبر معلوم ہے؟"

تیسری منزل والا کونے کا فلیٹ اب بالکل شعلوں اور دھوئیں کے نرغے میں تھا۔ سامنے

والی دیوار سے پلستر بہت اتر گیا تھا۔ ایک دو جگہ اچھے خاصے کھمبا نے کھل گئے تھے۔ اب وہ تھوڑا بے چین ہوا۔ "آگ تو بڑھتی ہی چلی جارہی ہے۔

مجھے بھی تشویش ہوئی۔" ہاں اب تو بہت بڑھ گئی ہے۔"

بولا۔" اصل میں میرے کمرے کی چھت زیادہ مضبوط نہیں ہے۔ پچھلی برسات میں بہت ٹپکی تھی۔" رکا۔ پھر آہستہ سے بولا۔" کہیں گر نہ پڑے۔" یہ کہتے کہتے میرا ہاتھ پکڑا "چلو چلیں"۔

وہ اور میں دونوں وہاں سے خاموشی سے سرک آئے۔ لوگ آتے چلے جا رہے تھے۔ شور بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ وہ اور میں شور سے دور ہوتے جا رہے تھے۔

اب اجالا ہو چلا تھا۔ برکت چائے والے کی دوکان کھل چکی تھی اور چولھے پہ رکھی کیتلی میں پانی سنسنانے لگا تھا۔ حاجی صاحب اور منشی احمد دین روز کی طرح آج بھی مسجد سے واپس ہوتے ہوئے یہاں آ بیٹھے تھے۔ حاجی صاحب کے ہونٹ ہل رہے تھے اور انگلیوں میں تسبیح گردش کر رہی تھی۔ وہ اور میں ان سے کسی قدر ہٹ کر مونڈھوں پر بیٹھے تھے۔ اور سامنے پڑی ہوئی ٹوٹی چھوٹی میز پہ چائے کی پیالیاں چینی چائے کا انتظار کر رہے تھے۔ برکت نے دوسرے چولھے پہ دودھ کی کڑھائی رکھی۔ پھر چائے کے برتن صاف کرنے لگا۔ پھر ہاتھ کپڑے سے پونچھتے پونچھتے منشی احمد دین سے مخاطب ہوا۔" منشی صاحب جی"۔

منشی احمد دین نے سوالیہ نظروں سے برکت کو دیکھا۔ برکت بولا۔" منشی صاحب جی مارکیٹ میں آگ لگی تو انہوں نے کہہ دیا کہ ہجوم نے آگ لگائی ہے۔ اب پوچھو یہ آگ کس نے لگائی ہے"۔

منشی احمد دین نے افسوس بھرے لہجہ میں کہا کہ" بھئی ہماری سمجھ میں تو کچھ نہیں آتا کہ یہ سب ہو کیا رہا ہے اور کیوں ہو رہا ہے۔ کیوں حاجی صاحب؟"

حاجی صاحب نے تسبیح پھیرتے پھیرتے ٹھنڈا سانس بھرا۔" اللہ ہم پہ رحم کرے۔"

منشی احمد دین بولے۔" جب ہم ایک دوسرے پہ رحم نہیں کرتے تو اللہ ہم پہ کیوں رحم کرے گا۔"

برکت نے پر زور لہجہ میں تائید کی۔" بالکل صحیح ہے جی۔ روز آگ، روز آگ، حد ہو گئی۔"

"ہاں حد ہی ہو گئی۔" منشی احمد دین بولے۔" ہماری یہ عمر ہونے کو آئی۔ اور کیسا کیسا زمانہ ہم نے

دیکھا۔ مگر اتنی آگیں کبھی نہیں دیکھی تھیں۔"

"کیوں جی کچھ چھوڑیں گے بھی یا سب ہی جلا ڈالیں گے؟"

حاجی صاحب تسبیح پھیرتے پھیرتے منشی احمد دین سے مخاطب ہوئے "منشی صاحب تمہیں یاد ہے جب پیلی حویلی میں آگ لگی تھی؟"

"یاد ہے" منشی احمد دین کہتے کہتے کانپ گئے "کیا قیامت کی آگ لگی تھی۔ لگتا تھا کہ ساری بستی جل جائے گی۔"

"ہاں" حاجی صاحب نے ٹھنڈا سانس بھرا "وہ حویلی کیا جلی، بستی ہی جل گئی۔ بعض بعض عمارت اسی طرح جلتی ہے کہ ساتھ میں بستی کی بستی راکھ کا ڈھیر بن جاتی ہے۔ اللہ بس اپنا رحم کرے" یہ حاجی صاحب نے پھر ایک ٹھنڈا سانس بھرا اور چپ ہو گئے۔

حاجی صاحب کی بات کا اتنا اثر ہوا کہ تھوڑی دیر کے لئے برکت اور منشی احمد دین بھی چپ ہو گئے۔ مگر پھر منشی احمد دین خاموشی سے گھبرا گئے۔ پوچھنے لگے "حاجی صاحب، پیلی حویلی تو غدر کے وقتوں کی تھی۔"

"ہاں انہیں وقتوں کی عمارت تھی۔ حضرت مہاجر مکی صاحب نے وہاں تین شب قیام فرمایا تھا۔"

"اچھا؟"

"ہاں تیسرے دن عجب واقعہ گزرا۔ مغرب کا وقت تھا حضرت صاحب اصطبل ہی کے اندر چوکی پہ بیٹھے وضو کر رہے تھے۔"

"اصطبل کے اندر؟" برکت نے چکرا کر سوال کیا۔

"ہاں اصطبل کے اندر۔ اصل میں وہ تو وہاں خفیہ ٹھہرے ہوئے تھے۔ خیال تھا کہ اصطبل کی طرف کسی کا دھیان نہیں جائے گا۔ مگر کسی بے دین نے سی آئی ڈی کر دی۔ کلکٹر گھوڑا کودا تا ہوا عین مغرب کی اذان کے وقت آن دھمکا۔ بولا کہ ویل نواب صاحب، ہم تمہارا گھوڑا دیکھنا مانگتا۔ اصطبل کھولو۔ نواب کے کاٹو تو خون نہیں۔ مگر حکم حاکم کیا کرتا۔ اصطبل کھول دیا۔"

حاجی صاحب بولتے بولتے رکے اور برکت اور منشی احمد دین دونوں کا دم گلے میں

آن اٹکا۔" اچھا؟ ..... پھر؟"

"پھر یہ کہ کلکٹر بھنبھناتا ہوا اندر داخل ہوا۔ کیا دیکھا کہ پانی فرش پہ بکھرا ہوا جیسے ابھی ابھی کسی نے وضو کیا ہو۔ لوٹا خالی۔ مصلےٰ بچھا ہوا۔ حضرت صاحب غائب۔

"غائب؟" برکت نے حیرت سے سوال کیا۔

"ہاں۔" حاجی صاحب نے اطمینان کے لہجے میں کہا۔

"کہاں گئے جی وہ؟"

"وہ۔" حاجی صاحب مسکرائے "حضرت صاحب؟ حضرت صاحب اس وقت تک مدینہ منورہ پہنچ چکے تھے۔"

"سبحان اللہ" منشی احمد دین کی زبان سے بیساختہ نکلا

"کمال ہو گیا جی" برکت کہتے کہتے کیتلی کی طرف متوجہ ہوا۔ کیتلی کا پانی ابلنے لگا تھا اور ڈھکن بھاپ کے زور سے اڑا جا رہا تھا۔ اس نے کیتلی چولھے سے اتار جلدی سے اس میں چائے کی پتی ڈال اور پیالیوں میں چائے تیار کرنے لگا۔

"حضرت صاحب بڑی ہستی تھے۔" منشی احمد دین بولے۔

"بھائی انہیں کے دم قدم کی برکت تھی۔" حاجی صاحب کہنے لگے کہ "غدر میں خون کی ندیاں بہہ گئیں مگر حویلی پہ آنچ نہیں آئی۔" چپ ہوئے۔ تامل کیا۔ پھر ہنسے اور بولے "خدا کی قدرت جس حویلی کا فرنگی کچھ نہیں بگاڑ سکا تھا اسے آگے چل کر انہوں ہی نے آگ لگا دی۔"

"ہم نے تو سنا ہے کہ وہ آگ بھی انگریزی ہی نے لگوائی تھی۔" منشی احمد دین بولے۔

"انگریز ہی نے لگوائی تھی۔ مگر لگی کس کے ہاتھوں سے۔ اپنے ہی بھائیوں کے ہاتھوں لگی تھی نا۔"

"یہ تو ہے۔" منشی احمد دین فوراً ہی قائل ہو گئے۔

برکت نے اب چائے بنائی تھی۔ دو پیالیاں حاجی صاحب اور منشی احمد دین کے سامنے رکھیں پھر دو پیالیاں ہماری میز پر لا کر رکھ دیں۔ منشی احمد دین نے پیالی اپنی طرف سرکائی۔ ایک

گھونٹ لیا۔ پھر پیالی رکھتے ہوئے بولے "مگر صاحب انگریز کا جواب نہیں۔"

یہ سنتے سنتے برکت نے جھرجھری لی جیسے اچانک اسے کچھ یاد آ گیا ہو۔ بولا "منشی جی وہ جو ایک گوری چمڑی والا دوسری منزل میں نکڑ والے فلیٹ میں رہتا تھا وہ مجھے دکھائی نہیں دیا۔"

"تم مسٹر جیمز کی بات کر رہے ہو؟"

"ہاں جی اسی کی۔ اس وقت سب فلیٹوں والے باہر نکلے کھڑے تھے۔ جانے وہ کہاں تھا۔ دکھائی تو دیا نہیں۔" یہ کہتے کہتے وہ ہم سے مخاطب ہوا "صاحب جی، آپ نے اسے دیکھا تھا؟"

وہ تو خاموش بیٹھا رہا۔ میں نے سادگی سے کہا "کبھی نظر نہیں آیا۔"

"یہی تو میں کہہ رہا ہوں۔ نظر تو آیا نہیں۔ گیا کہاں؟"

اتنے میں ممتاز آ گیا۔ تھکا تھکا سا، پسینے میں شرابور، منہ پر اور کپڑوں پہ ہلکی ہلکی سی کالونس۔ خاموشی سے کسی قدر بیزاری کے ساتھ ایک ہتھے والی انجر پنجر کرسی منشی احمد دین کے قریب گھسیٹ بیٹھ گیا۔ پھر کرتے کی جیب سے ادھ میلا رومال نکال گردن پونچھنے لگا۔

"کچھ کم ہوئی؟" منشی احمد دین نے کسی قدر تامل سے پوچھا۔

"کم؟ وہ تو بڑھتی ہی چلی جا رہی ہے۔" ممتاز چپ ہوا۔ پھر بڑبڑایا "لگتا ہے کہ پوری بلڈنگ ہی راکھ کا ڈھیر ہو جائے گی۔"

حاجی صاحب نے تسبیح پھیرتے پھیرتے ممتاز کو غور سے دیکھا۔ پھر سوال کیا "مختار صاحب کو تو اطلاع پہنچ گئی ہو گی؟"

ممتاز نے برا سا منہ بنایا "حاجی صاحب صبح ہی صبح کس کا نام لے دیا۔"

حاجی صاحب نے بہت متانت سے کہا "میاں میں یہ پوچھ رہا ہوں کہ مختار صاحب موقعۂ واردات پہ پہنچے یا نہیں پہنچے۔"

"پہنچ گیا جی۔ ایسے جتا رہا تھا جیسے اسے کچھ خبر ہی نہیں ہے۔"

"خبر تو کسی کو بھی نہیں تھی۔ خبر ہو جاتی تو آگ لگتی ہی کیوں۔" منشی احمد دین بولے۔

"اسے سب خبر تھی۔"

"مختار صاحب کو خبر تھی؟ غلط۔ یہ الزام تراشی ہے۔" منشی احمد دین نے بہت غصے سے ممتاز کو دیکھا۔

ممتاز نے منشی احمد دین کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ ان کی طرف سے منہ پھیر کر برکت سے مخاطب ہوا۔ "برکت، چائے بلوائے گا؟"

"ہاں جی۔ کیوں نہیں۔" برکت پھرتی سے چائے بنانے لگا۔

اخبار فروش سائیکل پہ پیڈل مارتا تیزی سے آیا۔ گذرتے گذرتے اردو کا ایک اخبار میز کی طرف اچھالا اور چھلاوا بن گیا۔ منشی احمد دین نے اخبار اٹھا کر ایک ورق حاجی صاحب کو پکڑا دیا۔ دوسرا ورق میز پہ پھیلا کر خود پڑھنے لگے۔ برکت نے چائے بنا کر پیالی بڑھائی۔ ممتاز نے تھوڑا اٹھ کر پیالی پکڑی۔ میز پہ رکھی۔ پینے لگا۔ منشی احمد دین نے کوئی خبر پوری پڑھی، کوئی آدھی، کسی کی صرف سرخی پہ نظر ڈالی۔ پھر ورق حاجی صاحب کے حوالے کیا۔ پھر کہنے لگے۔ "حاجی صاحب مشرق وسطیٰ میں حالات بگڑتے ہی جا رہے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ لڑائی پھر ہو گی۔"

"اور پھر عرب مار کھائیں گے۔" ممتاز چائے پیتے پیتے جلے بھنے لہجہ میں بولا۔

برکت نے ٹکڑا لگایا۔ "پاکستان میدان میں آجائے، پھر سالے یہودیوں کا کباڑا ہو جائیگا۔"

حاجی صاحب نے اخبار ایک طرف رکھا ایک خفیف سے زہر خند کے ساتھ بولے۔

"پاکستان پہلے گھر کی لڑائیوں کو تو نبٹا لے۔"

اس فقرے نے برکت پہ بہت اثر کیا۔ دکھ بھرے لہجہ میں کہنے لگا۔ "حاجی صاحب جی، کیا بات ہے کہ مسلمان جہاں بھی ہیں وہاں آپس میں لڑ رہے ہیں۔ بس اسی میں مارے جا رہے ہیں۔"

حاجی صاحب نے تامل کیا۔ پھر بولے۔ "یہ وقت مسلمانوں کے خلاف جا رہا ہے۔"

منشی احمد دین نے ٹکڑا لگایا۔ "یہ امریکہ کا زمانہ ہے۔"

برکت نے تردید کی۔ "اماں منشی جی، امریکہ کی تو فاختہ اڑ گئی۔ میں جانوں، اب روس کا زمانہ ہے۔"

"ایک ہی بات ہے۔" ممتاز نے پھر اسی جلے لہجہ میں کہا۔

برکت حاجی صاحب سے مخاطب ہوا "حاجی صاحب جی مسلمانوں کا زمانہ کب آوے گا۔"

"مسلمانوں کا زمانہ لنگ گیا" ممتاز اسی لہجے میں پھر بولا۔

"باشاؤ مڑکے آویگا" برکت نے اعتماد سے اعلان کیا۔

"ایسے ہی جیسے پاکستان میں مڑکے آیا ہے؟"

ممتاز کے اس وار نے برکت کو بالکل ہی نہتا کر دیا۔ لاجواب ہو کر وہ دودھ کی کڑھائی والے چولہے کی طرف متوجہ ہو گیا اور زور زور سے آگ پھونکنے لگا۔

ممتاز منشی احمد دین سے مخاطب ہوا "منشی صاحب، یہ مختار پہلے کیا تھا؟"

"پہلے تو کھیا نک تھا جی" برکت نے چولہے کو اس کے حال پر چھوڑا اور گرمی میں آگیا "بس ہمارے دیکھتے دیکھتے اس نے محل کھڑے کر لئے۔"

منشی احمد دین نے توجیح پیش کی "بہت محنتی آدمی ہے۔"

"محنتی آدمی" ممتاز زہر بھری ہنسی ہنسا۔

برکت بولا "منشی صاحب جی محنت کی کمائی میں بس روکھی روٹی کھائی جاسکتی ہے جائدادیں نہیں بنائی جاسکتیں۔"

رمضان کچھ ان حالوں آیا کہ بولتے بولتے سب چپ ہو گئے۔ منہ جھلسا ہوا، کالونس بچی ہوئی۔ کپڑے کچھ کچھ جلے ہوئے، کچھ دھوئیں میں رچے ہوئے۔ سر سے پیر تک پسینہ بہتا ہوا۔

"رمضان، چائے بناؤں تیرے لئے؟"

"نہیں۔ کوکاکولا۔"

برکت نے جلدی سے ایک کوکاکولا کھولا، اور رمضان کے ہاتھ میں پکڑا دیا۔ جب دو تین گھونٹ پی چکا تو خود ہی کھلا "ماسٹر کی بیوی خود تو نکل آئی بچے کو اندر چھوڑ آئی۔ بڑی مشکل سے نکالا ہے۔"

منشی احمد دین نے بڑی تشویش سے پوچھا "خیریت سے تھا؟"

"بس جی اللہ نے بچا لیا۔ جب میں اندر پہنچا ہوں تو آگ بالکل جھولے کے پاس آگئی تھی اور سارے میں دھواں بھرا ہوا تھا۔" رمضان چپ ہوا۔ پھر بولا "مگر بچہ نے کمال کر دیا جی چپر چپر چسنی چوس رہا تھا۔ بالکل نہیں رویا۔"

ممتاز نے دانت پیسے۔ آپ ہی آپ بڑبڑانے لگا۔ "سالا یزید کی اولاد۔"

رمضان ممتاز کو تکنے لگا۔ پھر اطلاعاً کہنے لگا۔ "اب پھنس گیا مختار۔"

"اچھا؟"

"ہاں۔ رحمت پکڑا گیا۔"

منشی احمد دین افسوس کے لہجہ میں کہنے لگے۔ "میں نے مختار صاحب سے کہا تھا کہ یہ آدمی تمہیں بدنام کرائے گا۔ وہی ہوا۔"

برکت بولا۔ "یہ یار رمضان مجھے کچھ اور شک پڑے ہے۔"

"کیا؟"

"یار وہ جو سفید چھڑی والا تھا جو دوسری منزل کے نکڑ والے فلیٹ میں رہتا تھا....."

"ہاں ہاں۔ جیمز۔"

"وہ ایک دم سے کہاں غائب ہو گیا۔"

"ہاں بے برکت تو کہوے تو ٹھیک ہے۔" رمضان سوچ میں پڑ گیا۔ پھر بڑبڑایا۔ "وہ گیا کہاں۔"

ممتاز غصے میں بڑبڑایا۔ "سب سالے ملے ہوئے ہیں۔"

منشی احمد دین بیٹھے بیٹھے اٹھ کھڑے ہوئے۔ "حاجی صاحب، پھر میں ذرا وہاں جا کے دیکھتا ہوں۔"

حاجی صاحب پھر خاموشی سے تسبیح پھیرنے لگے تھے۔ تسبیح پھیرتے پھیرتے انہوں نے منشی احمد دین کو دیکھا، آنکھوں ہی آنکھوں میں انہیں الوداع کہی اور پھر تسبیح پھیرنے لگے۔

ممتاز نے رمضان کو معنی خیز نظروں سے دیکھا۔ "میں نے منشی کے بارے میں کیا کہا تھا۔"

"مان گیا جی تمہیں ممتاز صاحب۔"

"برکت تم نے دیکھا۔" ممتاز برکت سے مخاطب ہوا۔ "منشی جی کیا اکھڑ رہے میری باتوں سے۔" وہ پھر غصے سے بڑبڑایا۔ "حرامزادے۔"

وہ بس بیٹھے بیٹھے اٹھ کھڑا ہوا۔ "چلو۔" میں نے کہا کہ "کہاں۔" بولا۔ "کہیں بھی۔ ہم دونوں

وہاں سے اٹھے چل پڑے۔ خاموش چلتے رہے۔ اب اچھی خاصی صبح تھی۔ دھوپ بھی نکل آئی تھی۔ اونچی منڈیروں پہ چمک رہی تھی۔ اکا دکا آدمی بھی چلتا پھرتا نظر آ رہا تھا۔ سواریاں تو اچھی خاصی ہی چلنی شروع ہو گئی تھیں۔ خاموش چلتے چلتے وہ مجھ سے دفعتاً مخاطب ہوا "تمہیں یاد ہے کہ ہم نے اس شہر کی گرمیوں کی دوپہر کس کس طرح گذاری ہیں۔"

"یاد ہے۔" یہ کہتے کہتے میرے تصور میں وہ ان گنت جلتی چمکتی دوپہریں امنڈ آئیں جو میں نے اور اس نے درختوں کے سائے میں بیٹھ کر، درختوں سے محروم فٹ پاتھوں پہ چل پھر کر، ائر کنڈیشننگ سے بے نیاز چائے خانوں میں سر جوڑ کر گذاری تھیں۔ مگر اس وقت ان کا کیا ذکر تھا۔ ہاں وہ اس کے بعد کہنے لگا "کبھی کبھی دوپہر میں چل چل کر میں تھک جاتا اور سوچتا کہ گھر جا کر آرام کروں۔ مگر بجلی کے پنکھے سے محروم وہ کمرہ دوپہر میں تندور کی طرح تپتا تھا۔ میں دوپہر کو وہاں لیٹ کر کبھی نہ سو سکا۔"

اس بات کا میں کیا جواب دیتا۔ سنتا رہا اور چلتا رہا۔ پھر وہ کہنے لگا "تمہیں پتہ ہے کہ کھانے کا اپنا قصہ تو بس ایسا ویسا ہی تھا تو میں نے اس چھت کے نیچے بھوکا رہ کر بھی بہت راتیں بسر کی ہیں۔ اور بھوک میں تو یہی ہوتا ہے کہ نیند آ بھی جاتی ہے اور نہیں بھی آتی۔" وہ چپ ہوا اور بولا "میں نے اس چھت کے نیچے بہت دکھ اٹھائے ہیں۔ اسے گرنا نہیں چاہیئے۔"

"یہ کیا منطق ہوئی۔" میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

اس نے تامل کیا۔ پھر بولا "شیخ علی ہجویری نے دیکھا کہ ایک پہاڑ ہے۔ پہاڑ میں آگ لگی ہوئی ہے۔ آگ کے اندر ایک چوہا ہے کہ سخت اذیت میں ہے اور اندھا دھند چکر کاٹ رہا ہے۔ چکر کاٹتے کاٹتے وہ پہاڑ سے اور پہاڑ کی آگ سے باہر نکل آیا۔ اور باہر نکلتے ہی مر گیا۔" وہ چپ ہوا۔ پھر آہستہ سے بولا "میں مرنا نہیں چاہتا۔"

یکایک فائر بریگیڈ کی تند و تیز آواز آنے لگی۔ مجھے کچھ تعجب سا ہوا "فائر بریگیڈ اب جا رہا ہے؟ اتنی دیر بعد؟" پھر میں نے سوچا کہ شاید یہ مزید کمک بھیجی جا رہی ہے۔

فائر بریگیڈ اپنے تند و تیز شور کے ساتھ سامنے سے گذرا چلا گیا۔ اور اب اچانک لوگ جانے کہاں سے ابل پڑے تھے۔ جہاں تہاں کھڑی ہوئی ٹولیاں خوف بھری سرگوشیاں، تبصرہ آرائیاں

"آگ لگ گئی؟" ـــــ "اب کے کہاں آگ لگی؟" ـــــ "کچھ باقی بھی بچے گا یا سب کچھ جل جائے گا" ـــــ ٹھنڈا سانس ـــــ "اللہ ہم پہ رحم کرے"۔ ـــــ ایک اور ٹھنڈا سانس "بہت برا وقت آ گیا ہے۔"

میں نے یونہی پوچھ لیا "آگ بجھ بھی جائے گی؟"

اسنے مجھے حیرت سے دیکھا "کونسی آگ؟"

"یہی جو لگی ہے۔"

"اچھا یہ آگ؟" وہ سوچ میں پڑ گیا۔ پھر بولا "تمہارا کیا خیال ہے۔"

"شاید بجھ ہی جائے۔" میں نے کہا "فائر بریگیڈ تو پہنچ گیا ہے۔"

وہ زہر بھری ہنسی ہنسا "ہاں فائر بریگیڈ تو پہنچ گیا ہے۔"

ہم پھر خاموشی چلنے لگے۔ چل رہے تھے کہ وہ بولا "اگر آگ نہ بجھی تو یہ سب لوگ کہاں جائیں گے۔"

میں نے ایک خوف کے ساتھ اس سراسیمہ خلقت کو یاد کیا جسے میں ابھی گھروں سے باہر نکلا ہوا دیکھ کر آیا تھا۔ میں نے کہا کہ "خدا کرے آگ بجھ ہی جائے۔"

وہ چپ رہا۔ میں بھی چپ ہو گیا۔ ہم دونوں چپ چلنے لگے دیر تک چپ چلتے رہے پھر میں نے کسی قدر جھجکتے ہوئے کہا "تم میرے گھر آجاؤ۔"

"تمہارے گھر" وہ عجیب طرح سے ہنسا۔ میں کھسیانا سا ہو گیا۔

ہم دیر تک خاموش چلتے رہے مجھے خیال ہوا کہ شاید آگ کے خیال نے اسے بہت پریشان کر رکھا ہے۔ بات بدلنے کی نیت سے میں نے کوئی بات کہی۔ پھر اس نے کوئی بات کہی۔ کوئی ادھر کی بات کوئی اُدھر کی بات۔ پھر اور اور ذکر نکل آئے۔ اور دور دور تک دھیان گیا۔ دن گرم تھا۔ دھوپ ابھی خاصی تیز تھی۔ اور وہ اور میں گھوم رہے تھے؛ بے مقصد بے وجہ، کبھی اس سڑک پہ کبھی اس سڑک پر۔ گذشتہ آوارگی کی روایت تازہ ہو رہی تھی۔ اب ہم پہلے کی طرح کہاں اکٹھے ہوئے تھے اور اب تپتی دوپہروں اور سنسان راتوں میں آوارہ پھرتے تھے اب اپنی اپنی زندگی تھی اپنا اپنا دھندا تھا۔ آج اچھے خاصے دنوں کے بعد ملے تھے۔ اور عجب ملے کہ

کوچہ گردی کی سوئی ہوئی رگ پھڑک اٹھی۔ سارے دن گھومتے رہے۔ رات گئے تک اس چائے خانے سے اٹھ کر اس چائے خانے میں، اس چائے خانے سے اٹھ کر اس خرابے میں۔ آخر کو رات ڈھلنے لگی اور میں اور وہ دونوں تھک کر چور ہو گئے: "اچھا اب میں گھر چلا۔"

"گھر؟" میں نے اسے حیرت سے دیکھا۔

"ہاں گھر۔" وہ بولا۔ "میں نے اس چھت کے نیچے بہت دکھ دیکھے ہیں۔ اسے گرنا نہیں چاہیے۔"

"مگر....." جانے میں کیا کہنا چاہتا تھا۔ کچھ الجھ سا گیا۔

اس نے بہت متانت سے کسی قدر غیر جذباتی لہجہ میں کہا: "تم ٹھیک سوچتے ہو۔ مگر میں مرنا نہیں چاہتا۔"

میں دیکھتا ہی رہ گیا۔ وہ چلا گیا۔ اپنے گھر کی طرف، اپنی آگ کی طرف۔